بہتی گنگا

گلزار جاوید

537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹریج۔III، راولپنڈی۔46000 (پاکستان)

گھڑی پر نظر پڑتے ہی ایک دفعہ اس کے ہوش اڑ گئے۔ جہاں تک اُسے یاد ہے آج اس نے اپنے افسر اعلیٰ سے ایک گھنٹہ قبل گھر جانے کی چھٹی لے لی تھی۔ چھٹی کیا اطلاع دے دی تھی۔ دفتر ہٰذا میں کوئی کام نہ ہونے کے باعث افسرِ اعلیٰ کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا جس طرح اُن کے ماتحت دفتری اوقات کے بعد ذاتی کاروبار یا ملازمت کرتے تھے اسی طرح افسر اعلیٰ بھی ایک بڑے کاروبار کے مالک تھے۔

ذاتی سامان سمیٹتے ہوئے اُسے اپنی پریشانی پر خود ہی ہنسی آنے لگی۔ پریشانی کے بجائے بیوقوفی کہیں تو زیادہ ٹھیک ہے۔ جن لوگوں کے سبب وہ عجلت کا مظاہرہ کر رہا تھا اُن کی سب سے بڑی خوبی اگر کوئی ہے تو وہ وعدہ اور وقت کی عدم پاسداری ہے۔ جھوٹ بولنا اور لاف زنی کرنا اُن پر ختم ہے اور عشق کے معاملے میں تو بیچارے اس قدر نرم دل واقع ہوئے ہیں کہ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر موقع پر میر کے اس شعر کی تصویر بنے نظر آتے ہیں:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اب اُس کی رفتار اور احساسات میں روزمرہ کا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ دورِ قدیم کی موٹر سائیکل پر روزانہ کی طرح آج بھی ورزش کرنے کے بعد گاڑھے دھویں کا ٹانک پھانک کر اُس نے گھر کی راہ لی، مگر راستے بھر اُسے یہ سوچ ستاتی رہی کہ اُس کی تنک مزاج بیوی جو ہمیشہ سے اُس کی کمیونٹی کے لوگوں کو نہ صرف ناپسند کرتی بلکہ اکثر کا تو گھر میں داخلہ بھی بند کر دیتی ہے اگر آج اُس نے مہمانوں کی تواضع میں اُسی بخیلی سے کام لیا تو اُس کی کرکری ہو جائے گی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کی ناک کے نتھنوں نے خوشگوار پکوان کی خوشبو محسوس کی تو مارے خوشی کے بیگم کی تعریف کے پُل باندھ دیے۔ جواب میں بیگم نے اُس ہاتھ پر چمٹا مارتے ہوئے جس سے موصوف ندیدے پن سے پکوڑہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہا ''میں سب جانتی ہوں تمہیں اور تمہارے حواریوں کو۔ اگر اللہ میاں نے قبیلے، ذات، برادری کے سرداروں کی طرح جھوٹوں کا سردار بھی بنانا ہوتا تو اُس کی نظرِ انتخاب تم یا تمہارے کسی پھوکے دانشور کے حصے میں آنی تھی''

مسئلہ درپیش یہ تھا کہ موصوف کی بیٹھک میرے خیال میں اتنا ڈی گریڈ کرنا زیادتی ہے، ڈرائنگ روم میں دو صوفے ایک سنگل اور دو قدیم کرسیوں کے ساتھ کل چودہ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش موجود تھی جبکہ مدعوئین کی تعداد بیس افراد کو محیط تھی۔ پہلے تو موصوف نے سوچا کیوں نہ ڈاکٹر افضل کے گھر سے کرسیاں منگوالی جائیں پھر اُس کا خیال حافظ محمد احمد کی طرف گیا، مگر اچانک ایک نئے خیال کا کوندا اُس کے ذہن میں کوندا۔ پہلے تو اُس نے صوفے، سنگل اور دو پرانی کرسیوں کو دائیں بائیں کر کے جگہ بنانے کی کوشش کی پھر ڈائننگ ٹیبل کی ایک ایک کر کے چھ کی چھ کرسیاں تازہ بنائے گئے کونوں کھدروں میں جما دیں۔

شاید آپ جانتے ہوں کہ میرے یہ مہربان لباس، وضع قطع اور زندگی میں باقاعدگی کو شجرۂ ممنونہ گردانتے ہیں۔ اگر آپ اُن کے بکھرے ہوئے بال، بڑھی ہوئی شیو یا لباس کی شکنوں کی طرف توجہ دلائیں تو وہ فیثا غورث، ارسطو، سقراط سے لے کر دنیا بھر کے اہلِ قلم اور دانشوروں کے اقوال کی اتنی لمبی قطار لگا دیں گے کہ آپ کے جتنے بھی طبق ہیں وہ روشن ہونے کے بجائے تاریکی میں ڈھل جائیں گے۔

موصوف نے بھی اس حوالے سے بیگم کی تمام تر ہدایات کو پسِ پشت ڈال کر سینٹر ٹیبل پر پیر پھیلائے اور کُشن اٹھا کر صوفے کی پشت

سے ٹیک لگائی اور آرام فرمانے لگے۔ پہلے تو اُنہوں نے جیب سے اپنی نوٹ بک نکالی اور اُس میں چند تخلیقات کی نوک پلک درست کی پھر بیگم کو آواز دیتے ہوئے کہا ''لو بھئی بیگم ہو گیا، بہت خوب، یوں سمجھو کہ آج کی محفل تمہارے سر تاج کے سر'' بیگم نے بیسن میں سَنے ہاتھوں کو موصوف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری تخلیقات مجھے یہ بتاؤ یہ سر تاج کون ہیں'' موصوف خواہش کے باوجود بیگم کے سوال کا جواب نہ دے سکے اور دائیں پیر کے پنجے کو ہلاتے ہوئے چچا غالب پر ہاتھ صاف کرنے لگے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

کچھ تھکن، کچھ بوریت اور کچھ انتظار نے طبیعت میں بیزاری پیدا کی تو وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے سونے کی کوشش کرنے لگے۔ نیند کے بجائے خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب یہاں ہمیں بھی شعر کا سہارا لینا پڑے گا:

کچھ تو ہوتے ہیں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

طبیعت وراثت میں حسّاس ملی تھی۔ کچھ گھریلو حالات، کچھ گردوپیش نے اُسے مزید سان پہ چڑھا دیا۔ دل میں کچھ کرنے کی اُمنگ کلبلانے لگی۔ پندرہ یا شاید سولہ کا سن ہوگا کہ ایک رات گھر کا صحن جو اینٹوں کے کھڑنجے سے بنا ہوا تھا، پر بچھی بان کی چارپائی پر سوتے ہوئے موصوف کو دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ آنکھیں ملتے ہوئے موصوف نے دروازہ کھولا تو باہر کسی کو نہ پایا۔ حیرت سے سر مارتے ہوئے آ کر پھر سے بان کی چارپائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہوئی تھی کہ موصوف کو پھر آہٹ سنائی دی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا پھر مایوسی ہوئی۔ دوسری بار جب سونے کی کوشش کی اور آواز پھر محسوس ہوئی تو موصوف نے سوچا کہ یہ اُن کا وہم نہ ہو، مگر رات کے سنّاٹے نے کچھ ہی دیر میں اُن کو یہ بتلا دیا کہ یہ آواز کہیں اور سے نہیں اُن کے دل سے آ رہی ہے۔

کچھ دیر تو وہ کروٹیں بدلنے کے دوران دل کی آواز کے بجائے نیند کو پکارنے لگے، مگر جب کسی طور نیند کی دیوی اُن پر مہربان نہ ہوئی تو چارپائی چھوڑ کر موصوف نے گھر میں لگے ہینڈ پمپ کے پانی سے منہ پر چھینٹے مارے اور گھڑونچی پر رکھے گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی پیا اور کمرے میں جلتی دھیمی روشنی کی لالٹین کی لَو کو بڑھاتے ہوئے اکلوتی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد کاغذ قلم اٹھا کر ''مصنّف'' کے نام سے ایک افسانہ لکھ ڈالا جو فرقہ وارانہ فسادات سے نفرت کے ردّعمل کا نمائندہ تھا۔

یہ ایک بے ربط اور طفلانہ تحریر تھی، مگر انور میاں کی مہربانی اور تقی بھائی کی بالائی والی چائے نے کہانی کو کسی نہ کسی طور شائع کرا ہی دیا۔ موصوف کہانی کی اشاعت کے بعد پھولے نہ سمائے، لیکن اُن کے اندر جو بے کلی اور بے چینی تھی وہ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ وہ کچھ نیا، مختلف اور انوکھا کام کرنا چاہتے تھے جس سے اخوت، بھائی چارہ اور انسانیت کی بھلائی کا کام لیا جا سکے۔ گھر کی دال روٹی جس طرح چل رہی تھی یہ اُن کے ابّا میاں ہی جانتے تھے، مگر موصوف کے دل و دماغ میں پلنے اور بڑھنے والے خیالات تسلسل سے گھر کرتے جا رہے تھے۔ عمر بھی اُس دور میں داخل ہو چکی تھی جہاں ارادوں کے ساتھ عقل بھی کام شروع کر دیتی ہے۔ اس بیچ بہت سی تخلیقات موصوف کے قلم سے منظر عام پر آتی رہیں جن میں انور بھائی اور تقی چائے والے کا اُتنا ہی دخل تھا جتنا موصوف کے قلم کا۔

کہاں تو موصوف نے پہلی تخلیق فرقہ وارانہ فسادات پر لکھی اور کہاں یہ وقت آ گیا کہ موصوف کے دل و دماغ پر ملک کے ایک صوبے میں ہونے والے لسانی فسادات نے اس درجہ دل گرفتہ کیا کہ موصوف نے ہفتوں نہیں مہینوں کی کاوش کے بعد اُس موضوع کو کچھ اس خوبصورتی سے لکھا کہ موصوف کے اپنے دل سے یہ آواز آئی ''کہ آج تم نے یا تمہارے قلم نے وہ کام کر دکھایا جو برسوں سے تم کرنا چاہتے تھے۔''

یہ خیالات کسی بھی تخلیق کار کے ہو سکتے ہیں بلکہ اکثر تخلیق کار اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا کرتے ہیں کہ اُن سے بڑا تخلیق کار کوئی نہیں، لیکن موصوف نے تمام تر خوشی اور اطمینان کے باوجود یہ جستجو شروع کر دی کہ کسی نہ کسی سے اس بارے میں رہنمائی ضرور لی جائے۔ ایک دن موصوف اپنے دفتر میں بیٹھے انہی سوچوں میں غلطاں اور پیچاں تھے کہ یہ بیل کب اور کس طرح منڈھے چڑھے گی

کہ غیر ارادی طور پر اُن کی انگلیوں نے اپنے استاد بشیر فاخری کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری طرف سے ''ہیلو'' کی آواز پر موصوف کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ موصوف نے گھبراہٹ میں سوچا:

''کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے''

دوسری طرف سے دوبارہ ''ہیلو'' کی آواز پر موصوف نے خود کو یکسو کرتے ہوئے سلام و پیام کے بعد جب اپنا نام بتلایا تو بشیر فاخری خوشی سے اچھل پڑے ''ارے بھئی کہاں ہو! کیسے ہو، کیا کرتے ہو، کس طرح یاد کیا'' ایک ہی سانس میں استاد کے ڈھیر سارے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے موصوف نے قدر ہکلاتے ہوئے کہا ''سر میں حاضر ہونا چاہتا تھا'' بلند قہقہہ.....تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے جب دل چاہے چلے آؤ، مگر آتے ہوئے میری پسند کی حلوہ پوری لانا نہ بھولنا۔

استاد نے بھی موصوف کے لیے تواضع کا انتظام کیا ہوا تھا۔ جس میں حلوہ پوری نے تھوڑا رنگ اور بھر دیا۔ بشیر فاخری نامور استاد اور بلند قامت اہلِ قلم کے ساتھ شفیق انسان بھی تھے۔ ایک خاص مشغلہ خشک خوراکی کا ہر وقت ساتھ رکھتے اور اگر کھانا لذیذ ہوتا تو اُس سے خوب خوب انصاف کرتے جس طرح آج حلوہ پوری سے کر رہے تھے۔

ناشتے کے بعد استاد شاگرد نے اپنا اپنا چائے کا کپ لیا اور ڈائننگ سے ڈرائنگ روم میں آ کر آمنے سامنے کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ہاں تو میاں! سناؤ مدت بعد ہماری یاد کیونکر آئی؟ قبل اس کے کہ موصوف کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتے بشیر فاخری پھر گویا ہوئے۔ ''بھئی ہمیں تو تم اکثر یاد آتے ہو جس میں تم سے زیادہ ہماری اور ہمارے معدے کی غرض شامل ہوتی ہے۔ تمہارے علاوہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہمیں کہاں کی حلوہ پوری، کہاں کے کیک رس اور کہاں کی باقر خانی پسند ہے'' اس مرتبہ موصوف نے الفاظ کی فضول خرچی کے بجائے کوٹ کی دائیں جیب سے چند کاغذ نکال کر استاد کے سامنے رکھ دیے۔ ''یہ کیا ہے؟'' کہتے ہوئے بشیر فاخری نے کاغذ اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں فاخری کاغذ پڑھتے جاتے اُن کی آنکھوں کی حرکت اور چہرے کی رنگت میں تبدیلی آتی جاتی جسے دیکھ کر موصوف کو پسینے آنے لگے۔ فاخری صاحب نے موصوف کے دیے ہوئے کاغذات پڑھنے کے بعد بِنا کچھ کہے سنے گھر کے اندر کا رُخ کیا اور چند منٹ کے وقفے کے بعد اپنے لیٹر ہیڈ کے ایک کاغذ کے ساتھ واپس لوٹے تو ملک کے ایک نامور جریدے کے مدیر کے نام خط میں لکھا تھا: ''شکل اس نوجوان کی ہیرو جیسی ہے اور کہانی میں نشہ ہیروئن کا''

ہم چاہیں تو کہانی کو یہاں یہ کہہ کر ختم کر سکتے ہیں کہ اُس کے بعد موصوف کے قلم سے اس طرز کی بے شمار کہانیاں نکلیں جو اُن کی مخصوص شناخت بن گئیں اور وہ نہ صرف وطن بلکہ وطن سے باہر بھی ایک معروف تخلیق کار کے طور پر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُن پر تحقیق ہوئی، اُن کی تخلیقات کے تراجم ہوئے، دوسری زبانوں میں کتابیں بھی لکھی گئیں، مگر موصوف کے اندر سلگنے والی آگ جلنے کے بجائے بھڑکنے لگی۔

وطن، وہ وطن جو سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو اور سہانے خوابوں کی بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رو بہ زوال ہوتا گیا جس نے موصوف کے سینے میں سلگنے والی آگ کو جلنے کے بجائے بھڑکا دیا۔

موصوف نے اپنے دوست احباب اور بہت سے صاحبِ اختیار شناساؤں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی، مگر کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ تن تنہا شخص کر بھی کیا کر سکتا ہے جو موصوف کرتے۔ ادیب، شاعر، مصور، موسیقار، گلوکار، اداکار، مفکر، مفسر راستہ تو دکھلا سکتا ہے، مگر راستے پر نہ تو چلنے کے ذرائع مہیا کر سکتا ہے اور نہ ہی اُس کے پاس الہٰ دین کا ایسا کوئی چراغ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ بدعنوان حکمرانوں کو ''کھُل جا سم سم'' کہہ کر ٹھیک کر سکے۔

مگر ہمارے ہاں حکمراں کیا، آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ ہم گھٹنوں تک نہیں گلے تک دھنس چکے ہیں اور وہ بھی دلدل نہیں غلاظت میں اور غلاظت بھی ایسی کہ اگر انسان باضمیر ہے تو سوچ کر ہی اُس کی سانس بند ہو جائے۔ یا تو موصوف سخت جان تھے یا حالات نے اُن کو اس حد تک دیوانہ بنا دیا تھا کہ موصوف نے اُن کو درست کرنے کی ترکیب تلاش کر ڈالی۔ بیس کروڑ کے ملک کو سدھارنے کے لیے اپنی برادری کے بیس چنیدہ لوگوں کا انتخاب کیا جن میں سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مثبت سوچ کے حامل تھے۔

پروگرام، آئین یا لائحۂ عمل یہ طے کیا گیا کہ ہر شخص جو جہاں جس حیثیت میں ہے قلمی جہاد کے ذریعے چور، ڈاکو، لٹیرے، راہزن اور بدقماشوں کے اکھٹ کو بے نقاب کر کے ملک کے عوام کو نہ صرف اُن کے چنگل سے آزاد کرائے گا بلکہ اُنہیں یہ احساس بھی دلائے گا کہ دنیا میں صرف دو قومیں بستی ہیں ''ایک ظالم اور ایک مظلوم''

''صاب خیریت ہے؟'' چپراسی کے ہاتھ کے لمس اور دیوار پر لگی بوسیدہ گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ کر اُسے وقت کا اعتبار نہ آیا، میز کی دراز سے موبائل نکال کر وقت دیکھا تو موصوف کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ غصے سے چپراسی کی طرف دیکھتے ہوئے ''تم نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟'' چپراسی نے کالے اور کتھئی اور چھدرے دانتوں سے مسخری کے انداز میں ''میں نے سوچا آپ سہانے خوابوں میں گم ہیں تو کیوں میں آپ کو تنگ کروں'' چپراسی کی بے تکلفی پر اُسے غصہ تو بہت آیا، مگر اُس کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے ''چاچا باز آجاؤ'' چپراسی جی صاب کہتا ہوا باہر جانے لگا تو موصوف نے آواز دے کر ''چاچا ایک کپ چائے بناؤ، مگر ہونی لاہور والی چاہیے'' چپراسی جی اچھا کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ہُوحق کرتا ہوا کمرہ اور اُس کی تنہائی نے اُس کے دل پہ کچوکے لگانا شروع کر دیے۔ پاس کوئی عزیز وغم خوار ہوتا تو وہ اپنی کیفیت اُس سے بانٹ کر جی ہولا کر لیتا، مگر اس وقت جو کیفیت اُس پر حاوی تھی اُس کے ذائقے سے وہ قطعی نامانوس تھا۔

کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ مجھے تو کبھی رات کو بھی اس قدر گہرا خواب نہیں آیا اور آج دن میں.....! موصوف نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بے ترتیبی سے انگڑائی لی جس کے دوران جماہی کے لیے منہ خود بخود کھُل گیا۔ جوں ہی موصوف نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تو موصوف کو آج پھر وہی دستک سنائی دینے لگی جو پندرہ سولہ کے سن میں رات کے وقت سنائی دی تھی، مگر آج نہ تو وہ چونکا اور نہ ہی دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ کوشش کی تو اپنے دل کی آواز سننے کی کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ آواز ہو نہ ہو میرے دل سے آرہی ہے۔ موصوف نے دائیں بائیں دیکھ کر اطمینان کرتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور اپنے کانوں کو دل کی دھڑکن سے ہمرشتہ کر لیا۔ ایک منٹ، دو منٹ، تیسرے منٹ کے بعد آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے، ہولے ہولے موصوف کے کانوں میں آواز محسوس ہوئی ''دیکھ لیا خواب، مل گئی تعبیر، آ گئی تبدیلی، ٹائیں ٹائیں فش''

''کون کہتا ہے یہ خواب تھا؟'' موصوف کو اپنی آواز کے بلند ہونے کا احساس ہوا تو موصوف نے اسی جملے کو آہستگی سے دہرا کر ہولے سے کہا ''وہ خواب ہی کیا جو ختم ہو جائیں''.....وقفہ.....تو پھر سر نیچے کر اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ.....دیکھ اپنے گریبان میں جھانک کر.....غور کر اور سچ سچ بتا جس کرپٹ مافیا کو بدلنے کے لیے تم خود ساختہ ادیب، شاعر، دانشور اور مفکر جھوٹے سچے خواب دیکھتے اور پروگرام بناتے ہو کیا تم اور تمہارے بھائی بند اُن کی کچی چھتوں کو پکّا کرنے کے لیے اپنے قلم کی روشنائی صرف نہیں کرتے؟ اور اس چُلو بھر روشنائی کے عوض چھوٹے بڑے طرّم خان بننے کے لیے اُن کے آگے ایڑیاں نہیں رگڑتے؟ اور جب تمہاری مراد بَر آتی ہے تو راتوں رات چھوٹے بڑے طرّم خان پیدا کر کے تم بھی اُن کی طرح ناخدائی کے دعوے دار بن جاتے ہو اور اپنے خود ساختہ طرّم خانوں سے ہی کام لینا شروع کر دیتے ہو جو تمہارے ناخدا تم سے لے رہے ہیں۔

تو پھر گلہ کاہے کا...؟ شکوہ کس بات کا.....؟ گنگا بہہ رہی ہے وہ بھی نہا رہے ہیں تم بھی نہائے جاؤ.....اور پربھو کے گُن گائے جاؤ!

○○

انتخاب کلام شمیم کرہانی

شمیم کرہانی ایک معروف ومقبول شاعر تھے۔ خوش روئی وخوش خوئی، خوش گوئی وخوش گلوئی ان کی اس مقبولیت کے اہم عناصر تھے۔

وہ ایک قادرالکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں غمِ جاناں بھی ہے، غمِ دوراں بھی۔ غمِ دل بھی ہے غمِ روزگار بھی۔ غمِ حیات بھی ہے غمِ کائنات بھی۔ ان کی غزلوں میں داخلیت وخارجیت، روایت اور عصری حسیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود جامعیت کا حامل یہ انتخاب ان کی شاعرانہ شخصیت کا پورا احاطہ کرتا ہے۔

مرتب: پروفیسر حنیف کیفی، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی